

اُردو کے ایک بڑے فطرت نگار، افسانہ نگار مجتہد الیاس کہ ایک مختصر
ایک عورت کہ کہانی،
اس کا نام زلیخا تھا اور کوئے یوسف اُسے مطلوب نہایت تھا۔

عورت

اُردو ادب کا عطر، دوسرے منتخب کہانی

ایک دم کوٹ لے کر اٹھ جاتا اور گھوڑے کو دو چارنگی
گالیوں سے نواز کر اپنے دن کا آغاز کرتا۔ جاگ جانے کے
باوجود چمٹن کی آنکھیں ابھی بند ہوتیں۔ وہ تیل اور میل
کچیل میں گندھے ہوئے تکیے کے نیچے سے استری شدہ ریڈ
لیپ مار کا سگریٹ کا پکٹ ہاتھ میں لے کر اس میں سے ایک
سگریٹ نکالتا جو پکٹ دب جانے کی وجہ سے چپٹا ہوا ہوتا۔
سگریٹ زبان پر رکھ کر گھماتا، جب وہ تھوک سے تر پڑتا ہوتا
تو زبان سے چپک جانے والے تمباکو کے ذرات تھوکتے
ہوئے تکیے کے نیچے سے دیا سلائی کی ڈیاٹل کر نکالتا۔ جوں
ہی سگریٹ سلکتا، پچھپھرٹوں کی صفائی کا مشقت طلب عمل
از خود شروع ہو جاتا۔ ہر کش سے پہلے اور بعد کھکھرم کھکھرم کی
لے پر کھانسی اور بلغم کی اتھل پھل کا گھبراہٹ پڑتا۔ بھلے
سوں تو ایک آدھ سگریٹ ہی سے کام چل جایا کرتا تھا لیکن
اب دوسرے سگریٹ کے پہلے نصف پر کہیں جا کر اس کے
بھاگ جاتے تھے۔ اپنے سر تاج کی کھانسی کے الارم پر بھی
زلیخا فوراً نہ جاگتی تو ارشاد ہوتا۔ ”اری اٹھ جا بے سرم“ نیوں

گرمیوں کے موسم میں صبح سویرے تین بجے ہی سڑک کے
کنارے لگی ہوئی سرکاری ٹوٹی میں سے پھر پھر کے ساتھ پانی
نکل کر سینٹ کے فرش پر گرنے لگتا، اس کے تیز شور کی وجہ
سے چند گز کے فاصلے پر اپنے ایک کمرے پر مشتمل گھر کے
دروازے کے آگے بھی چارپائی پر سوئے ہوئے چمٹن کی
نیند کا سلسلہ ٹوٹ جاتا۔ پاس ہی ایک جھلنگا چارپائی پر اُس کی
کم بن بیٹی اور بیٹا ایک دوسرے کے اوپر نیچے پڑے سو رہے
ہوتے۔ چونکہ گھوڑا، بیٹی اور بیٹے کی نسبت زیادہ کار آمد اور
قیمتی تھا لہذا اسے دروازے کے آگے اس طرح سے باندھ
رکھا ہوتا کہ دونوں چارپائیوں، تانگے اور گھر کے حصار میں
محفوظ رہے۔ گھوڑے سے دو گز آگے تانگا اپنے دونوں
پیتوں کے سارے پینہ زمین سے نکائے دونوں بازو آسمان کی
جانب بلند کیے رات بھر خدا سے بچوں اور ان کی ماں کے
گناہوں کی معافی مانگتا رہتا۔ بچوں کی ماں زلیخا کمرے کے اندر
ٹاٹ کے پردے کی اوٹ میں فرش پر پڑی سو رہی ہوتی۔
چمٹن اپنی ہی طرز کا ایک مرد تھا جسے محض اپنے مرد ہونے
ہی پر بڑا فخر تھا۔ بقول اس کے ”زلیخا رانا“ چمٹن خان کی جو رو
تھی اور ”راج پوتہاں“ کی بہو ہے، کسی ایرے غیرے کی
نہیں جو ڈومنیوں کی طرح باہر سڑک پر پڑی سوتی رہے۔ بھلے
گرمی سے مرجائے لیکن اندر ہی رہے۔

چمٹن کی کسل مندی دور کرنے کے لیے گھوڑا ہلکی آواز
میں پھرڑکا مارتے ہوئے اپنی پچھلی ٹانگیں قدرے وا کر کے
اکڑا لیتا اور پیلے زرد بھاگ دار پیشاب کی موٹی سی دھار
اینٹوں کے اونچے فرش پر سرکاری قلعے سے پریش کے ساتھ
مارتا تو اس کی پھوار چمٹن کے بدن پر ننگے حصے چھو جاتی۔ وہ



چڑھے کھلیارے پڑی رہوے۔“

کمرے کے اندر آئے ہاتھ کوٹنے میں نین کے ایک خالی ڈبے کے اوپر ڈیڑھ فٹ سائز کا کعب نما لکڑی کا کرٹ اونداھا پڑا ہوتا۔ کرٹ کے اوپر ایک بڑا سا سوراخ تھا۔ دو اطراف سے تو کمرے کی دیواروں نے بڑے احسن طریقے سے مطلوبہ پردہ پوشی کے مقاصد پورے کر رکھے تھے، بقیہ دونوں جانب لٹکا ہوا ٹاٹ، پردہ چاک کیے رکھتا تھا۔ یہ اس گھرانے کا بیت الخلا تھا۔ اس سے استفادہ کرنے کے وہی آداب تھے جو انگلش کموڈ کے استعمال میں روا رکھے جاتے ہیں۔ یہ محض خلا کی مہم جوئی میں مصروف ہو جاتا تو زلیخا بیٹے کو بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑتی اور بیٹی کو بالوں سے نوچتی۔ ابھی دونوں بچے آدھے سوئے آدھے جاگے کی کیفیت ہی میں ہوتے تو انھیں بازوؤں سے پکڑ کر توری کی طرح لٹکائے گھر کے دروازے کے ساتھ ہستی گندے پانی کی ٹالی پر بٹھادیا جاتا۔ زیر عمل فعل پر پورا بوجھ صرف کرنے کے بجائے دونوں بچے اپنے گھوڑے کی تھلید میں ایک پاؤں پر سارا بوجھ ڈال کر دیوار کے ساتھ کندھے ٹیک کر بیٹھے سنے دیکھنے لگتے اور انھی سامنے سپنوں میں اپنی تشنہ تکمیل خواہشات میں ناجائز طور پر تجاوز کر کے

ایک ایک آنے والی کھوئے ملائی کی ٹھنڈی مٹھی تھپتھپایاں کھانے لگتے۔ گھوڑا بچوں کو اپنی نقل اتارتے دیکھتا تو پھر پھر پھر رکی آوازیں اپنے نتھنوں سے خارج کر کے انھیں ٹوکتا۔ گھوڑے کی ہر تنبیہ پر وہ اپنی اعصابی قوت براہ راست بروئے کار لا کر جاری فطری عمل مرحلہ وار پایہ تکمیل تک پہنچاتے۔ اس دوران یہ محض میدان مار چکا ہوتا لیکن سینے میں شرابور، آدھ موہو کے باہر چارپائی پر آکے ڈھیر ہو جاتا۔ زلیخا بیت الخلا سے ڈبا اٹھا کر باہر آجاتی اور جو کچھ بھی اس میں اس کے خاوند نامراد کی کاوشوں کا ثمر ہوتا، ٹالی میں بہا دیتی۔ علی الصبح معروضی حالات اس خاندان کی موافقت میں ہوتے۔ بد رو میں پانی کا ہماؤ تیز ہوتا۔ زلیخا اسی پانی میں ڈبا کھنکھال کر خود عازم بیت الخلا ہو جاتی، حالانکہ تھی وہ پاؤں کی جوتی لیکن اکثر کام ایسے کرتی جیسے انسان کے فطری تقاضوں کے عین مطابق ہوتے ہیں، بس کی وجہ سے یہ محض کوٹاؤ آجاتا۔ وہ اپنی کھوئی ہوئی توانائی بحال کر چکتا تو دونوں گھرے اور بالٹی پانی سے بھر کے اندر لے آتا۔ بیت الخلا کے مقابل دائیں کونے میں پڑے اسٹو اور کھانے پکانے کے برتنوں کے پاس رکھ دیتا۔ یہ اس گھرانے کا باورچی خانہ تھا۔



محمد الیاس، اردو کے ایک تازہ کار فسانہ نگار، بنیادی طور پر مصوٰر، پیدائش، گجرات، پاکستان، 22 دسمبر 1946ء۔ الف بے کی شناخت سے پہلے لکیروں اور رنگوں سے شغف تھا۔ مدبر سب رنگ کے نام، ان کے ایک خط کے مطابق کچھ اُنھی کی زبان۔ "میٹرک تک تو فن میں خاصا نکھار آگیا تھا۔ ہائی اسکول کی تعلیم کے دوران چند افسانے لکھے جو اس وقت کے معروف فلمی جرائد میں شائع ہوئے۔ طبعاً نفاست طبع، نہایت خوش لباس۔ اسے کوئی نفسی پیچیدگی کہہ لیجیے، لباس کے معاملے میں بہت زیادہ SELECTIVE تھا۔ اسی دور میں لاہور سفر کے دوران پاک ٹی ہاؤس میں جانا ہوا اور شاعر خوش نوا حبیب جالب سے ملاقات ہوئی۔ بہت اشتیاق تھا ان سے ملنے کا۔ ان کی ظاہری حالت بڑی خستہ و شکستہ تھی۔ لباس میلا، شیو اور بال بڑھے ہوئے۔ ان کی مالی حالت کے بارے میں بڑے مایوس کن انکشافات ہوئے تو مصوٰری اور ادب سے خوف زدہ ہو گیا۔ تعلیم کا سلسلہ بی اے سے آگے نہ بڑھ سکا اور ٹکینے نے کس لیا۔ معدنیات کے حصول کے لیے ملک کے دوردراز پہاڑی علاقوں کے مسلسل سفر، پھر بڑے شہروں میں ان کی نکاسی کے لیے سوداگری ہی سے مہلت نہیں ملتی تھی۔ زندگی کا برا حصہ اس کاروبار میں صرف ہوا، پھر ایک اور آزمائش سے دوچار ہوا۔ ایسا صدمہ برداشت کرنا پڑا کہ شاید مر گیا ہوتا۔ چھوٹا بیٹا حیدر علی سانول ابھی ساڑھے چار سال کا تھا کہ کینسر کے عارضے میں پھنسنے لگا۔ وہ بہت ہی پیار کرنے والا بیٹا تھا۔ اس سے بڑا بیٹا اور دو بیٹیاں اور بیوی زندہ رہنے کا جواز تھے۔ سانول کی موت کے بعد گرمیوں کی چھٹیوں میں ڈیڑھ ماہ کے لیے بیوی بچے کراچی گئے تو تنہائی میں خود کو دریافت کرنے کے عمل سے گزرنے کا موقع ملا، اس عرصے میں تھوڑی سی شاعری کی اور افسانے لکھے۔ ان کی پزیرائی توقع سے زیادہ ہوئی تاہم براہ راست اپنے اصل ڈکھ کے پس منظر میں کوئی افسانہ لکھنے میں کامیابی نہ ہو سکی۔ البتہ 1996ء کے آخر میں ایک افسانہ "بوسہ دوا" کچھ اس موضوع پر لکھا۔ یہ "اوراق" میں شائع ہوا اور ڈاکٹر وزیر آغا نے بہت پسند کیا۔ ادب کا یہ احسان ہے کہ نکھرنے سے بچالیا۔ اس لیے فیصلہ کیا ہے کہ باقی زندگی اس احسان کا قرض چکاتا رہوں۔ ابتدائی اور موجودہ افسانوں کے

telegram link https://t.me/+l_Fxda8LnVViOGU0

بھر کے کھاوے اور بھینس کی تریا (طرح)۔۔۔ ذاتی طور پر گالیوں میں عملی کردار ادا کرنے سے آگتا جاتا تو رضا کارانہ طور پر اپنی سر تاجی گھوڑے کے سر پہ سجادتا۔

جب تک پٹھمن سلور (الیومینیم) کے گلاس میں ایک پاؤ دودھ، ایک آنے والا بروک بانڈ چائے کا پتا، گڑ کی بجھلی اور چھ عدد رس لے کر لوٹا، کم و بیش اسی وقت مقامی تھانے کا حوال دار شاہ سوار شاہ سرکاری تل پہ نہانے آجاتا۔ وہ نزدیک ہی کرائے کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہتا تھا۔ بقول پٹھمن وہ واقعی سرکاری سانڈ کی طرح پلا ہوا تھا۔ لگ بھگ چالیس سال کا تھا۔ اونچا، لمبا، چوڑا چکلا، جن کا جن اور شہ زور۔ لگتا تھا جیسے خدا نے اسے بناتے ہوئے کھلے دل سے ہر میٹرل استعمال کیا تھا اور جو بیکار مال مسالا اس کی تعمیر میں سے بچ گیا تھا، اس سے کسی شاگرد پیشہ فرشتے کے ہاتھوں پٹھمن کو مختصر وجود کے قالب میں ڈھال دیا گیا۔ سوار شاہ کا چہرہ اور سر بہت بڑا سا تھا۔ گردن خاصی موٹی اور ہونٹ بھرے بھرے، سر کے بال چھوٹے لیکن سیاہ کالے۔ اوپر والے ہونٹ کے اوپر اور ناک کے نیچے خاصی چوڑی جگہ

چونکہ جو رو کا پردہ زیادہ اہم مسئلہ تھا اس لیے شیوہ مردانگی کے تقاضوں کے عین مطابق وہ پانی اور سودا سلف لانے کی مشقت برداشت کر لیتا۔

اس اثنا میں فجر کی اذانیں ہونے لگتیں۔ اگر اب تک زلیخا کی گلو خلاصی ہو چکی ہوتی تو وہ بیت الخلا سے نکل کر چند منٹوں کے اندر اندر چائے کا پانی ایلنے کے لیے رکھ دیتی ورنہ پٹھمن کھانسی کے جھٹکوں میں مختلف النوع الفاظ بلا کر اگلنے لگتا۔ "ابے جلدی کر تیرے باوا کی ٹرین نکل جاوے گی۔ اری وہ ماں کا قسم سرکاری سانڈ آنے والا ہے۔"

سرکاری سانڈ علی الصباح ہی اس کے حواس پر چھانے لگتا۔ پٹھمن کی خواہش ہوتی کہ اس کے آنے سے قبل ہی ڈبا دوسری مرتبہ نالی تک کا سفر مکمل کر کے لوٹ جائے۔ اس عورت کی مت واقعی گھڑی تلے تھی، نہ جانے کن مسائل میں الجھ کر مزید تاخیر کر دیتی تو حضرت سرتاج کا پارا ہوا نیزے پہ آجاتا اس لیے اپنے مستحق اور مقفی الفاظ قریب ہی ہستی ہوئی گندی نالی میں رواں دواں مرکب آمیزے میں ڈبو بھگو کر اندر اچھالنے لگتا۔ "ابے سری اٹھ جا۔ تیری ماں۔۔۔ نوکرا

درمیان تعطل کا عرصہ اٹھائیس برس کے قریب ہے۔

بہتر ہے، اس دوسرے دور میں محمد الیاس کے افسانوں کے بارے میں چند مشابہتیں کی رائے بھی ذہن نشین کر لیجیے۔

”محمد الیاس کا بہت قائل ہو رہا ہوں۔ ان کے افسانے پانی، سادہ اور وارے کی عورت ابلاغ میں پڑتے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب کے دیہات کو ایک گہرہ افسانہ نگار مل گیا ہے۔ (مدیر ابلاغ کے نام محمود ہاشمی کے ایک خط سے اقتباس)

”محمد الیاس، میرپور کے پہاڑوں کی اوٹ سے اچانک برآمد ہوا تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا مگر وہ عین میرے سامنے پہاڑ کا پہاڑ کھڑا تھا اور آسمان کو چھوتے اس پہاڑ کا سبزہ اور سبزے پر بسے ہوئے درخت اور چرند و پرند اور کپڑے مکڑے اور آدم زاد سبھی میرے ذہن میں اس مانند گھس آئے گویا وہ عین میرے دل و دماغ میں آباد ہوں یا پھر میں ہی ازل سے وہیں رو رہا ہوں۔ مجھے آئندہ رسائل میں محمد الیاس کی ٹوہ لگی رہے گی اور ملاقات ہونے پر میں اسے بہ سرت اپنے ہاتھوں میں لے کر بیٹھ جاؤں گا“ (جوگندر پال)

”سعادت حسن منٹو بھی حقیقت نگار تھا مگر محمد الیاس میں منہاس زیادہ ہے۔ اس نے سفاک چٹائیوں کو شوگر کوئیڈ لفظوں میں ملفوف کر دیا ہے، کہیں طنز کی تیز دھار دو دھاری تلواری کی طرح جسہ احساس کے آر پار ہو جاتی ہے، دوسری جانب اس نے زندگی کی خوب صورتیوں سے صرف نظر نہیں کیا ہے“ (پروفیسر محمد فیروز شاہ)

”محمد الیاس کی افسانہ نگاری اور کہانیوں میں روش روش ہمیں معذوری، بت تراشی، شاعری اور محبت کے انہماک کا خوب صورت امتزاج ملتا ہے۔ اس فطری امتزاج نے نہ صرف الیاس کو تخلیقی و فنی سطح پر بصیرت عطا کی ہے بلکہ رنگ دوام بھی فراہم کیا ہے۔“ (احسان رانا)

”محمد الیاس اردو افسانے کی دنیا میں نیا نام سہی لیکن افسانے کے فن پر ان کی دست رس، زبان و بیان پر قدرت اور جملے



Zegham imran

کہیں کھو جاتا۔ موصوف اپنا طویل ترین، زندہ تابندہ غسل پتھمن کے گھر کی جانب رخ کر کے پایہ تکمیل تک پہنچاتا۔ پتھمن اس دوران ٹاٹ کے پردے کی اوٹ میں بیٹھا مسلسل زیر لب مغالطات بکا کرتا اور معاشرے کی بگڑتی ہوئی اخلاقی اقدار پر جی جان سے کڑھ کر اپنے من کا بھاری بوجھ ہلکا کرنے کی سعی نامتو کرتا رہتا۔ کافی دنوں سے سینا جا رہا تھا کہ سوار شاہ چھوٹا تھانے دار بننے والا ہے اور ترقی پاتے ہی وہ تھانے کے نزدیک سرکاری کوارٹر میں منتقل ہو جائے گا۔ پتھمن دل میں خیال کرنا کہ اس بھینے کو موت آنی تو ممکن نہیں لہذا خدا کے حضور سچے دل سے دعا کرنا کہ وہ چھوٹا چھوڑ سب سے بڑا تھانے دار بن جائے، جنم میں جائے، لیکن اس محلے سے جلد از جلد دفع ہو جائے۔

گجراتی مٹی کا پیالہ دو مرتبہ گڑ کے گرم گرم امرت سے لبالب بھر کے مع تین عدد رس تناول کر کے پتھمن خان تانگے میں بیٹھتے ہی چھانٹا گھوڑے کے بدن سے ایک دو گز دور ہوا میں تیزی سے لہرا کر سائیں سائیں کی آوازیں نکالتا اور لاکارتا۔ ”چل میرے شیزادے“ (شیزادے)

موجود تھی جس پر ہونٹوں کے دونوں گوشوں تک سارے ایریا پر کالی اور گھنی مونچھیں اگی ہوئی تھیں۔ پھرے ہوئے تیل کی طرح موٹی آنکھیں جن میں سرخی رہتی اور خوب موٹی بھوئیں آپس میں جڑی ہوئی تھیں۔ رنگ گورا اور سرخ۔ نظر بھر کے دیکھتا تو لگتا کہ کوئی جسیم وحشی درندہ جڑے کھولے اپنا مقابل شکار سمونچا نکلنے کے لیے جھپٹا مارنے کو ہے۔ پتھمن کی متلون مزاجی کے باعث گلی کے دیگر ساکن ٹونٹی سے پانی بھرتے ہوئے اپنے منہ دھیان رہتے لیکن سوار شاہ پانی بھرنا تو درکنار، بغیر نفیس غسل ہی یہاں کرتا تھا حالانکہ اس وقت تک روشنی پھیل چکی ہوتی۔ وہ ازراہ تکلف مل مل جیسے کپڑے کا ایک ٹکڑا جسم پر اڑس لیتا۔ وہ کھل کھلا کر بڑا بھرپور غسل کرتا۔ اڑوس پڑوس یا آس پاس سے گزرنے والے اپنی ذاتی ذمے داری پر یا رضا کارانہ طور پر حوال دار کو بحالت غسل دیکھ سکتے تھے ورنہ مشغول غسل شخصیت نے اپنی عالی ظرفی کے باد صغ کبھی کسی کے شوق دید پر قدغن نہیں لگائی۔ کپڑا غریب بھیگ جانے کے بعد ستر پوشی کرنے میں اپنی ناکامی اور کم مائیگی پر از خود شرمسار ہو کر پہنائیوں میں سب گنگ

تراشنے کا ہنر اس امر کا متقاضی ہے کہ ان کا نام ہمارے سر کردہ افسانہ نگاروں کے ساتھ لیا جائے۔ ان کی کہانیاں اپنے موضوع اور ٹریٹ منٹ کے لحاظ سے اس قدر متنوع اور حقیقت سے قریب تر ہیں کہ قاری دیر تک اپنے آپ کو اس فضا میں محسوس کرتا ہے۔“ (محسن بھوپالی)

ان معزز و محترم آسمائے گرامی کے بعد مدبر سب رنگ کے لیے کہنے کو کیا رہ جاتا ہے۔ صورت یہ ہے کہ 70 م کے بعد اردو افسانہ عجب انتشار بلکہ کس پرسی سے دوچار ہے، 70 م کے بعد چند معتبر افسانہ نگار اور چند یادگار افسانے انگلیوں پر شمار کیے جاسکتے ہیں۔ طرح طرح سے ہمارے سبھا، ہمارے نگران ناقدین کرام، اس کمیابی و نایابی کی تشخیص کرتے ہیں اور صرف تشخیص تک بات رہ جاتی ہے۔ باعثِ دروں کچھ رہا ہو، احوال واقعی اس قدر ہے کہ اردو افسانہ کہیں کھو گیا، بھٹک گیا ہے۔ وہ افسانہ جو دوسری زبانوں کے مقابلے میں ایک زمانے سے ہمارا اعتبار قائم کیے ہوئے تھا۔ اور کوئی کیا جانے، ایسے میں کسی نیلو فر اقبال، کسی محمد الیاس اور کسی نیر مسعود وغیرہ کی جانب سے کوئی ایسی چیز جسے عرف عام میں کبھی افسانہ یا کہانی کہا جاتا تھا، سامنے آجائے تو کیا خوب درمان چشم ویراں ہو۔ افسانے کے نام پر انشائیہ، تجریدیہ، تجربیہ، علاقہ سے تو سوزش اور فزوں ہو جاتی ہے۔ اس خط الرجال میں معدودے چند روایتی افسانے کے علم بردار نوواردان میں ایک محمد الیاس بھی ہیں۔ ان کی یہ کہانی، عورت گھوڑا اور مرد دیکھیے ان کی واقعیت، میں بڑی تکنیکی اور ٹنڈی ہے۔ محمد الیاس کی صاف گوئی و بے باکی اور کہانی برتنے کے طور سے امکانات کی کوئٹلیں پھوٹی نظر آتی ہیں۔ اپنے بس میں یہی کچھ ہے کہ محمد الیاس کے عزم کی استواری کے لیے دست دعا دراز کریں۔ یوں اس خرابے پر تو چار اطراف دُھند ہی دُھند چھائی ہوئی ہے۔ کچھ دکھائی، کچھائی نہیں دیتا کہ کس کا رخ کس طرف ہے، یہ شورشِ بادی کو کس دیوار پر جا کے ڈھیر کر دے۔ (مدیر)



<https://www.facebook.com/groups/372605677178945/>

پیش کرے۔ کیوں کہ روٹی کے معاملے میں موصوف کا ذوق بڑا بلند تھا۔ کام کاج سے فارغ ہو کر زلیخا آرام کرنے کے لیے لیٹ جاتی۔ آرام کرنے کے لیے اسے پورے مواقع میسر تھے چونکہ اس کے سر کا سائیں صبح جاتے ہوئے اپنی کھات اندر رکھ کر جاتا تھا۔ سردیاں گرمیاں اس کے لیے ایک جیسی تھیں۔ کبھی کوئی رُت اس کے لیے کُکھ کے لمحے لے کر نہیں آئی۔ کُکھوں سے اس کا جنم جنم کا بیر تھا۔ اس کا یہ ایمان تھا کہ وہ جہاں بھی جائے گی، مقدّر تعاقب میں رہے گا۔ وہ کبھی کسی مرد سے متاثر نہیں ہوئی، نہ ہی کسی میں اسے کوئی دل چسپی تھی۔ وہ دنیا کے تمام مردوں سے نفرت کرتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ مردوں کے بہروپ تو مختلف ہو سکتے ہیں لیکن اصل روپ ایک سے ہیں۔ اس کا اپنا مرا ہوا باپ اور بھائی بھی ایسے ہی تھے۔ اوپر چوہارے میں رہنے والا بابو سعید احمد بیڑھیاں اُترتے چڑھتے اور سامنے سے گزرتے ہوئے کسی شدید جذبہ خیر سگالی کے زیر اثر کن انگلیوں سے اسے دیکھتا اور مسکرایا کرتا لیکن جب پچھمن گھر میں ہوتا تو اس کی ذات میں پھپھی ہوئی شرافت کی دبیز چادر اس کا سارا سراپا ڈھانپ سب بگ

زلیخا ٹاٹ کی اوٹ سے زیر لب بڑبڑا کر اپنے دل میں سربستہ راز جیسی ایک خواہش، کمان پر چڑھا کر بددعا کا زہریلا تیر پچھمن کی پیٹھ پر رسید کر دیتی۔ ”جاتیں مرجائے تیری لاس (لاش) آئے گھرماں (میں) مٹے دھار کے لڈو بانٹوں۔“ دونوں بچے خود ہی دیواروں کے سایوں کے ساتھ ساتھ اپنی چارپائی تھینٹے رہتے۔ وہ سگریٹ کی خالی ڈبیاں اور دیگر بے شمار اشیاء جو سڑک پر یا ادھر ادھر گری پڑی ملتیں، اپنے توشہ خانے میں شامل کر لیتے اور ان کے ساتھ جی جان سے کھیلتے رہتے۔ انھوں نے اپنی ماں سے کوئی مطالبہ کر کے اسے کبھی دیکھ نہیں دیا۔ انسانی فطرت میں شامل کسی خواہش کی تکمیل کی خاطر مطالبہ کرنے کے لیے اگر کوئی مخصوص عنصر بطور جزو شامل ہونا ضروری ہوتا ہے تو زلیخا کے بچوں کی تعمیر کے عمل پر مامور کسی کارکن فرشتے نے ان کا خمیر گوندھتے ہوئے یقیناً اسے ترک کر دیا تھا۔

پچھمن ہر روز رات گھر کوٹھتے ہوئے سبزی منڈی ٹوٹ کر لے آیا کرتا اس لیے دوسرے روز زلیخا ہنڈیا پکا چکتی تو آنا گوندھ کر رکھ چھوڑتی تاکہ پچھمن گھر کوٹھے تو تازہ پھانکا پکا کر

لیتی۔

کمرے کے پچھواڑے میں جو دکان بازار میں کھلتی تھی، پچھمن کے سگے ماموں رانا فتح محمد کی تھی جسے وہ خود بھی اور دیگر برادری والے بچتے پھروٹ مرچٹ کہتے تھے۔ رانا کی بیوی کب کی مرچکی تھی۔ اب وہ ساٹھ کے پیٹے میں تھا۔ اس کی اولاد اپنے اپنے گھروں میں آباد تھی۔ روہنگی طرز میں نفاست کے ساتھ کیسری رنگ کی گڑی باندھتا۔ بڑی بڑی موچیں گالوں پر پھیل کر گل مجھے بناتی تھیں۔ چوڑے سانولے چہرے اور جسم سے ساری جوانی کا نور ہو کر صرف آنکھوں میں سمٹ آئی تھی۔ اپنے حلیے اور منفرد رکھ رکھاؤ کی وجہ سے پتہ چلتا تھا کہ وہ ایک کرڑا راج پوت ہے۔ اپنی دکان میں فروٹ کے لیے جوڑے گئے کریڑوں کے پیچھے اقامت پزیر تھا۔ پچھمن کا کرا اور رانا کی دکان ایک ہی دیوار دو حصوں میں تقسیم کرتی تھی جس میں ایک دروازہ تھا جسے پچھمن نے روز اول ہی سے لمبی لمبی میخیں لگا کر مستقل بند کر رکھا تھا۔ وہ اپنے ماموں سے شدید نفرت کرتا تھا۔ ماماں بھی تو عمر کے ساتھ بدلا نہیں تھا۔ شادی سے پہلے جب زلیخا ابھی چھوٹی تھی تو وہ اسے ورغلانے سے باز نہیں رہتا تھا، دکان پر سودا لینے آتی تو وہ اسے دعوت دیتا کہ وہ جس قدر چاہے کریڑوں کے پیچھے بیٹھ کر فروٹ کھالے اور پیسے بھی لے لے۔ زلیخا کی شادی پچھمن سے ہو گئی تو وہ اپنے میاں کے حکم پر پردہ کرنے لگی۔ پچھمن صاف کہتا۔ ”میرا ماماں بڑا کھنجر (خنزیر) ہے۔“ ماماں کہتا۔ ”میرا بھانجا حرام جاہ ہے۔“ ویسے ماماں تھا بڑا رنگین مزاج۔ اداکارہ نیلو کا اپنے تئیں بلا شرکت غیرے عاشق۔ نیلو کے بڑے بڑے رنگین پوسٹر ساری دکان کی دیواروں پر سجائے تھے، اُس کی ہر قلم کا دوسرا یا تیسرا شو بلاناغہ دیکھتا۔ پردہ اسکرین سے دوری اُسے کھلتی تھی اس لیے بارہ آنے والی کلاس میں سب سے اگلی رو میں براجمان ہو کر نیلو کا ہر پوز ہاریک بینی اور انتہائی دل چسپی سے اپنی آنکھوں میں سمو لیتا۔ ماماں بھانجے اور ان کی برادری کے بیش تر افراد ’خ‘ ف‘ ش‘ اور ن وغیرہ کے ساتھ خدا واسلے کا بیر رکھتے تھے۔ ماماں نیلو سے اپنی بے پناہ محبت کے باوجود اسے لیلو کہہ کر یاد کرتا۔ بھری جوانی کے ایام میں وہ نیلو کی کسی کھڑکی توڑ

سبب

قلم کا نظارہ کر رہا تھا۔ دورانِ رقص موصوفہ نے کوئی ایسا غیر معمولی ایکشن پیش کیا جو غالباً سنسر کی نذر ہونے سے بچ کر ’حق‘ بہ حق دار رسید کے مصداق تماشا سٹیوں کے رُو برو آگیا۔ رانا جی اس ادا پر بے بس و بے اختیار ہو کر ایسے فریفتہ ہوئے کہ بھرے سینما ہال کے اندر دیوانگی میں بے ساختہ بہ آواز بلند پکار اٹھے۔ ”ہائے ری لیلو تھو راپاب (پیشاب) پی لوں۔“ یہ موصوف کی نیلو سے حد درجے کی عقیدت کا شاخصانہ تھا۔ وارفتگی کے منہ زور جذبات کے باعث وہ اس انتہائی اقدام پر بھی تسل گئے تھے۔ انھوں نے تو حقیقی محسوسات کی عکاسی بڑے قدرتی، سچے اور کھرے انداز میں کسی بناوٹ کے بغیر کر دی تھی لیکن ظالم سماج نے اس کے بجائے کہ ان کی سادگی اور حقیقت پسندی قدر کی نگاہ سے دیکھتا، اس نعرۂ مستانہ کو مذاق کا رنگ دے دیا۔

ماماں نے چھڑا چھانٹ ہونے کے بعد کئی ایک مرتبہ بھانجے سے بچتے بچاتے، موقع نکال کر اپنی دیرینہ پیش کش مزید پرکشش مراعات، ترغیبات، ترمیم و تجدید کے ساتھ زلیخا کے رُو بہ رُو ہم دردانہ غور اور فوری عمل درآمد کے لیے رکھ دی تھی مگر کوئی روپے پیسے والا دکان دار ہو، فیشن ایبل بابو ہو یا دہنگ حوال دار، زلیخا کو کسی سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ وہ سب مردوں کی نظروں کا مطلب اچھی طرح سمجھتی تھی۔ اشارے کنائے اور مسکراہٹیں، لیکن وہ چپ رہتی۔ وہ مرد کو ایک مغفل مخلوق سمجھتی جس میں ایک مخصوص طرح کی غلاظت بھری ہوتی ہے، مردوں کے تصور ہی سے اس کا جی متلانے لگتا۔ وہ منہ بھر کے ایک موٹا سا تھوک پھینکتی اور مرد کو ایک موٹی سی گالی دے کر مطمئن ہو جاتی۔ ماماں کبھی کبھار حوصلہ کر کے رشتے داری کا حق جتاتا اور بھانجے سے نصیحت کے رنگ میں کہتا۔ ”ابے کم عقل! نہ مارا کر جو رو کو، یہ بڑا جلم ہووے۔“ دراصل وہ ایک تیر سے دو نشانے لگانا چاہتا کہ شاید اس کی ہم دردی زلیخا پر اثر کرے اور دل کے اندر کسی گوشے میں اس کے لیے زماہٹ عمل پزیر ہونے لگے لیکن پچھمن کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلے ہوئے تھا، پہلے تو وہ صاف صاف کہتا۔ ”ماماں! تم ہمارے بچ ماماں مت بول، سننے ساری جندگی ماماں کی گھامی کری۔ ارے سننے کو جوان ہوں

کوہوان۔ سو بد ماس ڈالو، ایک پھلیسا بنے اور سو پھلیسا ڈالو، سالہ ایک کوہوان بنے۔ میں سب جانوں، ارے وہ بھڑوا بھی کوئی مرد ہووے جو جنانی کی ٹھکانی نہ کرے۔ تیں مجھے جو روکا گلام بنادیے؟“ جوش میں اس کی سانس پھولنے لگتی تو قدرے توقف سے پھر اپنے شوہری نسخہ ہائے کیمیا بیان کرنے لگتا۔ ”عام شکل (شکل) کی جو رو کو دن ماں ایک بار مارو تو کھوب صورت کو دو بار۔ ارے جلیکھی کو تین بار ماروں تو بھی کم ہے۔ سسری ہے ہی، بھید کی، بھید، اس لیے کبھی پھینٹی لگاؤں کبھی ناگاکا کردیوں۔“ پھر وہ غصے کے گھونٹ پی کر کہتا۔ ”اماں! منے کنی بار بولا، تیں ادھر مت آیا کر۔“

زیلخا کو اس بات پر بڑی الجھن ہوتی جب کوئی اسے کہتا کہ وہ خوب صورت ہے۔ وہ سوچتی کہ بس کوڑے کا ڈھیر ہوں۔ پھر اپنے ہاتھ دیکھ کر کہتی۔ ”ہاں رنگ گورا ہے، مین نقش پتہ نہیں کیسے ہیں؟ کبھی غور نہیں کیا۔“ پھر خود ہی اپنے سوال کا جواب دیتی۔ ”جیسے بھی ہیں، میں نے کوئی ریندھ کے کھانے ہیں، بھاڑ میں جاویں۔“ فارغ اوقات میں وہ چارپائی پر پڑی ہوتی تو دھلے ہوئے لٹھے کی طرح، جیسے کوئی ایسا مردہ جو زندگی میں گورا چٹا رہا ہو لیکن مرنے سے قبل کسی حادثے کی وجہ

کوکب نورانی اوکاڑوی کی مذہبی تصانیف

- ☆ دیوبند سے بریلی (حقائق)
- ☆ ازان اور درود شریف
- ☆ سفید و سیاہ (جہانِ برگ سے بریلی کتابچوں کا جواب)
- ☆ میرادین (اسلامی بنیادی عقائد اور ضروری معلومات)
- ☆ بدعت کی حقیقت
- ☆ مسئلہ امامت
- ☆ ختم شریف حضرت امانت بخش رضی اللہ عنہ
- ☆ احکام نبوی اور ہماری زندگی (مجموعہ احادیث)
- ☆ شجرہ طیبہ (اوراد و وظائف)
- ☆ مقالات کوکب
- ☆ بدہ مینے کے نیک اعمال
- ☆ اپنی ادا دیکھ (انہدی تراشوں کے عکس)

ضیاء القرآن پبلی کیشنز - اردو بازار - لاہور

سے اس کے بدن سے خون کا آخری قطرہ بھی نچر گیا ہو۔ وہ زندہ تھی بھی نہیں، کب کی مرچکی تھی۔ شاید بست سی گالیاں، ٹھنڈے، تھپڑ اور چھانٹے اس کے مقدمہ میں لکھے تھے جو ابھی اس نے پھمکن کی وساطت سے وصول کرنے تھے، اسی وجہ سے اس کا بے روح بت کمرے میں چلتا پھرتا رہتا۔ اسے اس سے کوئی سروکار نہ تھا کہ اس بہت بڑے شہر میں ایک کمرے کے گھر کے باہر بہت بڑی دنیا آباد ہے۔ نہ ہی اس کی کوئی واضح خواہشات تھیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہ چاہتی تھی کہ بچوں کو پیٹ بھر کے کھانا مل جائے اور اس کی مار کٹائی ذرا کم ہو یا یہ کہ پھمکن چھانٹے سے نہ مارے۔ اس کا چھانا بڑا ظالم تھا۔ بید کی سوئی کے آگے چڑے کی لمبی باریک آپس میں گندھی ہوئی رتیاں لگی تھیں۔ وہ اپنے گھوڑے کو چھانا مارتے ہوئے گھماتا زیادہ تھا لیکن ضرب لگانے کے بجائے پیٹ پر صرف رکھ دیتا تھا جب کہ گھر میں وہ چھانا گھماتا تو شوں شرپ کر کے نکادیتا۔ جس روز صبح یادو پھر اس کے بدن پر تین چار چھانٹے پڑ جاتے، سارا وقت کٹن ہوتی رہتی۔ جس اور گرمی میں وہ چارپائی پر لیٹی ہوتی تو مساموں سے پسینے کے قطرے پھوٹنے لگتے، جلد سے چپکی ہوئی میل گھل جاتی، چھانٹوں سے پڑے ہوئے نیل یوں دکھنے لگتے جیسے ان پر نمک یا تیزاب لگادیا گیا ہو۔ اس کے کپڑے بدن سے چپک جاتے، لمبے گھنے بالوں کی جڑوں میں پسینے کے سیلاب سے جوئیں پریشان ہو کر کھوپڑی میں گھسنے کی کوشش کرنے لگتیں۔ زیلخا اپنے دونوں ہاتھوں کی کنگھیاں کھبڑ کھبڑ بالوں میں چلانے لگتی۔ ٹاٹ کا پردہ ہلتا تو اس کا جی چاہتا، کاش یہ آگے سے ہٹ جائے اور عقبی دیوار میں نصب شدہ دروازہ چوٹ کھل جائے، روشنی اور ٹھنڈی ہوا کے جھوکے کمرے میں سرسراتے پھریں۔ یہ خواہش بیدار ہوتے ہی وہ تصور میں کھو جاتی اور یوں محسوس کرنے لگتی جیسے وہ کسی گھنے درخت کے نیچے کھلی فضا میں سوتر کی بنی ہوئی کھاٹ پر سوئی ہوئی ہے اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھوکے اس کے بدن سے مس ہو رہے ہیں جن سے اس کے جسم و جان میں راحت اور سکون رچ گیا ہے۔ ایسے ہی لمحات میں وہ سچ سچ سو جاتی اور تب اٹھتی جب پھمکن اس کی کھاٹ کو چھانٹے کی سوئی سے سب بگ

ضرب لگا کر کھٹاک کی آواز کے ساتھ ڈانٹا۔ ”اے سالی! بھگ کانہ تو نہیں کرنے لگی۔ یوں بے کھبر سووے ہے۔ جو کبھی کوئی لفنگاں کا یا راند رگھس آوے تو پھر؟ میں ایک نہ ایک روج میرے سے کتل کر ادے گی۔ سُری نئے کھاہ کھاہ کو نمی لگ جاوے گا۔“ (خواہ مخواہ پھانسی چڑھ جائے گا)

نہ جانے اس کا نام کیا تھا اور وہ کون تھی۔ سارے کوچوان اسے لیڈی کہتے تھے۔ وہ کالا ریشمی برقع اوڑھے ہوتی۔ گورے پاؤں میں کالے چمکیلے سینڈل، ہاتھوں کی جلد انتہائی اجلی اور ملائم۔ ایک ہاتھ میں ڈائری اور بڑا سا پرس۔ چہرے پر آنکھوں کے نیچے تک باریک سیاہ نقاب اس نفاست سے دونوں کانوں کے اوپر برقع میں اڑسا ہوتا کہ بڑی بڑی آنکھیں اور بھی نمایاں اور سحر انگیز لگتیں۔ جسمانی خدوخال کی موزونیت اور جاذبیت کا یہ عالم تھا کہ برقع مجبور محض ہو کے رہ گیا تھا۔ سراپا سے اٹھتی ہوئی بھینی بھینی مسک ایک کیف طاری کر دیتی۔ پیچھمن جی جان سے فریفتہ ہو چکا تھا لیکن اس کی ظاہری معاشرتی حیثیت، رکھ رکھاؤ اور حُسن کی سحر کاری سے اس قدر مرعوب تھا کہ اسے اپنے جذبات کے اظہار کا حوصلہ تھا نہ سلیقہ، لیکن جب وہ اس کے تانگے کی عقبی نشست پر بیٹھتی تو تانگے کا توازن برقرار رکھنے کے لیے پائمان پر کھڑے ہونے کے بجائے اگلی نشست پر پوری طرح ٹیک لگا کے بیٹھتا تاکہ حتی الامکان نزدیک ہو سکے۔ تاہم وہ اپنے دل کی باتیں گھوڑے سے کرنے لگتا۔ ”چل اوئے میری جان! آج اڑا لے چل پریاں کے دیس ماں۔“

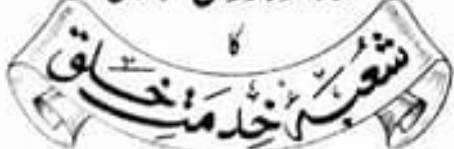
شروع شروع میں چند ایک بار پیچھمن نے کرایہ لے لیا۔ بعد میں جب بھی لیڈی نے کرائے کی رقم آگے بڑھائی، اس نے فوراً کہا۔ ”اجی سرمنده نہ کریں، آپ پر حلال، مجھ پہ حرام۔“ باریک پردے کے پیچھے وہ ایک دل آویز مسکراہٹ بکھیرتی اور تانگے سے اتر جاتی۔

وہ ہر ہفتے، سنیچر کو پچھلے پہر اسٹیشن سے صدر اور دوسرے روز اتوار کو پہلے پہر صدر سے واپس اسٹیشن آتی۔ یوں تو پیچھمن مشے از کوڑا کرکٹ ہی تھا مگر اب کچھ عرصے سے وہ سنیچر کو دھلی ہوئی چار خانے کی دھوتی اور صاف شلو کا پہننے

لگا تھا۔ پاؤں میں اپنے گھوڑے کے نتھنوں جیسے سوراخوں والے سلپر دھو کے سجالیتا۔ رگڑ کے داڑھی منڈواتا تو چھلے ہوئے آلو کی طرح لگتا، اُلنی مانگ نکالتا۔ اس روز ریڈ لیپ کے بجائے ہتھوڑا مار کا سگریٹ کا پیکٹ خریدتا۔ خوشبو والا پان کٹے میں دبائے گنگلتا پھرتا۔ ”بین نہ وجائیں منڈیا میری گت پسنی بن جائے دی۔“ کچھ زائد خرچ ہو جانے کے باعث اس روز ٹھیکے دار کے اڈے پر جوا بھی نہ کھیلتا لیکن گھوڑے کی قسط ٹھیکے دار ضرور وصول کر لیتا، خواہ اسے گھوڑوں کی راسوں میں ہاتھ ڈالنے پڑ جاتے۔ وہ یہ بھی لحاظ نہ کرتا کہ تانگے میں کوئی مریض یا زنانہ سواریاں بیٹھی ہیں۔ چرس اور جوئے میں ایک آنے کا ادھار نہ کرتا۔ لین دین کے معاملات میں ٹھیکے دار اپنے وضع کردہ اصول و ضوابط پر سختی سے کاربند تھا۔ وہ کہا کرتا کہ کسی کے گھر میں آنا ہو یا فاتحہ وصولی کے معاملے میں رعایت نہیں ہو سکتی۔ بقول اس کے وہ چار آنے کا بزنس کرتا تھا۔ مثلاً تانگا اسٹینڈ کا کمیشن چار آنے فی پھیلا، چرس فی گولی چار آنے، فلاش کھلاتے ہوئے چار آنے اڈے کی کات فی بوڈ، جوئے خانے میں چار آنے کی کپ چائے۔ جب کسی غریب یا مجبور کوچوان کو گھوڑا تانگایا ان دونوں میں سے کوئی ایک چیز قسطوں پر خرید کر دیتا تو ایک روپے پر چار آنے زائد منافع وصول کرتا۔ یعنی ہر مال ملے گا چار آنے۔

پیچھمن نے کافی دنوں سے ایک روپے والی لازمی کا ٹکٹ

مولانا اوکاڑوی اکادمی



کراچی شری فی موبائل سپنری شروع کرنے کا ارادہ رکھتا ہے جس کے ذریعے غریب آبادی کے علاقوں میں مختلف دواؤں اور بیماریوں سے متاثر ہونے والے انسانوں کو مفت دواؤں فراہم کی جائیں گی۔ ذوالسلازادہ سے اور غیر احباب اس نیک کام میں تعاون فرمائیں۔

ہمارے عزائم انشاء اللہ

قری موبائل ڈسپنری دارالترجمہ

دارالطبع العشر اسکول

آپ کے تعاون سے لاکھوں انسان فائدہ حاصل کر سکیں گے

مولانا اوکاڑوی اکادمی، بی۔ ۵۳، سندھی مسلم سوسائٹی کراچی

۳۵۲۵۳۴۳ - ۳۵۲۱۳۲۳

خرید کر رکھا تھا جس پر پانچ ہزار روپے کا انعام لکنا تھا۔ جوں جوں لیڈی، چھمکنے کے حواس پر چھاتی گئی، اس نے دن میں بھی کھلی آنکھوں سے سنے دیکھنے شروع کر دیے۔ وہ دیکھتا کہ پینٹ بوشٹ میں ملبوس ایک ہاتھ جیب میں، دوسرا لیڈی کے ہاتھ میں، منہ میں پائنگ شو کا سگریٹ، کبھی باغوں میں گھوم رہا ہے، کبھی کسی سینما ہاؤس کے باکس میں ایک ہی صوفے پر لیڈی کے ساتھ بیٹھا قلم دیکھ رہا ہے۔ تصور کے گھوڑے پہ سوار وہ ایسی خوش نما وادیوں کی سیر کرنے لگا کہ سرخوشی اور سرشاری سے چور چور ہو گیا۔ زلیخا کے خیال ہی سے اسے رگھن آنے لگی۔ وہ بڑبڑانے لگتا، کیسی مردار بیوی ملی ہے، کوئی جوش نہ دلولہ، یوں جیسے وہ زندگی نہیں گزار رہی بلکہ زندگی اسے گزار رہی ہے۔

آج آخری پھیرا اٹھانے کے بعد وہ اڑے پر گیا۔ ٹھیکے دار کو گھوڑے کی قسط ادا کی، دو گولیاں چرس کی خریدیں۔ پہلے وہ دو اڑھائی روپے گھر کے خرچ کے لیے بچا کر بقیہ رقم سے فلاش کھیل کر لیا تھا، آج لیڈی کی محبت کا نشہ سلایا ہوا تھا، پھر اسے یقین تھا کہ دوسرے روز صبح آٹھ بجے لائری کی قرعہ اندازی ہونی ہے، پانچ ہزار روپے اسے کمپنی کے اعلان کے مطابق نقد مل جانے ہیں اور پھر کل ہے بھی سنیچر۔ پچھلے پھر لیڈی سے ملاقات بھی ہونی ہے۔ گویا دوسرے دن کا سورج اس کی زندگی میں ایک انقلاب لے کر آ رہا تھا۔ وہ ترنگ میں سارے پیسے ہار گیا۔ گھر میں آنا بھی ختم تھا۔ وہ سبزی آٹے کے بغیر ہی گھر جا کے سو گیا۔ صبح اپنے وقت پہ اٹھا۔ بیت الخلا سے نکل کر گھوڑا جوتے لگا۔ جب چھاننا لینے اندر آیا تو زلیخا نے ناشتے کے بارے میں استفسار کر دیا۔ وہ زہر خند سے بولا۔ "ارے جبر کھالے کھد بھی اور سالے پلوں کو بھی کھلا۔ سُری ناشتہ مانگے ہے۔"

وہ ڈرتے ڈرتے بولی۔ "بچوں کے لیے تولادو، مجھے نہیں چاہیے۔"

وہ تیخ پا ہو گیا اور چیخا۔ "ارے نہیں مرتے یہ کنجری کے بچے، سالی بک بک کرے جارہی۔ (قدرے توقف سے) ہائے رے تکریر، کیسی کیسی خوراں جیسی لڑکیاں مر رہی ہیں۔ چھمکنے پر اور یہ دیکھ سالی، مکی چچر، مردار کہیں کی۔ سننے بی لگ گئی۔"

ذرا مزید تکرار بڑھی تو اس مرد کے بچے نے چار پانچ چھانے شوں شرپ زلیخا کی پینہ پر جھاڑ دیے۔ بچے رونے لگے تو نکلتے ہوئے ایک ایک بطور ناشتہ انھیں بھی رسید کر دیا۔

لائری والی کمپنی کے دفتر پر تالے پڑے تھے۔ سیکڑوں لوگ وہاں کھڑے شور مچا رہے تھے کہ فراڈ ہو گیا۔ چھمکنے نے یہاں اپنی گالیوں کا فلتھ (FILTH) اُن لوڈ کیا، اسے غصہ آ رہا تھا کہ صبح ہی صبح زلیخا متھے لگ گئی، سالی سے منہ ماری ہو گئی۔ منخوس نے پانچ ہزار روپے کا نقصان کرا دیا۔

پہلا پھیرا لے کر اسٹیشن پہنچا تو چائے رس کا ناشتہ کرنے لگا، اس دوران اُس نے بڑی گہری سوچ بچار کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ لیڈی اس سے پیسے کے لیے تو محبت کرتی نہیں، ویسے ہی مرتی ہے۔ پھر اس نے خود ہی سوال کیا۔ "کیا اسے معلوم نہیں کہ میں ایک معمولی کوچوان ہوں؟"۔۔۔ "بے سک، بے سک" وہ اس جواب پر منال ہو گیا۔ چنانچہ اس نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ زادِ راہ کے بغیر محض اپنے خالص جذبات کے بل بوتے پر محبت کے نئے سفر کا آغاز کر دیا جائے تاکہ عشق کی نئی منزل پر جلد از جلد پہنچ کر اس کے جملہ ثمرات سے فیض یاب ہو جاسکے۔ اس نے آج ہی لیڈی سے صاف صاف بات کرنے کی نھان لی۔

دوپہر کو چھمکنے گھر نہیں گیا۔ اسٹینڈ کے عقبی حصے میں نیم کے درخت تلے گھوڑا کھول کر اس کی پینہ اور گردن پر تھاپڑے مارے، تھوڑا سا کھرکنا لگا کر بڑے پیار سے ہاتھوں کے ساتھ مالش کی، ہاتھ پر سیدھے ہاتھ کی ہتھیلی سے مساج کرتے ہوئے اس کے ساتھ دھیمے لہجے میں پیار سے باتیں کرنے لگا۔ "دیکھ بے سالے! آج چھمکنے کی لاج رکھیو۔ سُسرے پھولاں جیسی لیڈی اپنے ساتھ بیٹھی ہووے تو تیری مریا یوں باجے جیسے بیس من بوجھ لدا ہو، سننے سرم آوے، اے میرے باپ! سبک چلا کر، نیوں جیسے کوئی ہوا میں تیر رہا ہووے۔" گھوڑے نے اپنے الف کھڑے کانوں کا رخ اس کی جانب کر کے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پھرڑکا مارا جیسے اس کی ساری باتیں غور سے سن کر پلے باندھ لی ہوں۔ چھمکنے مطمئن ہو کر مڑا ہی تھا کہ گھوڑے نے بڑے سر میں ہنسنا کر اسے متوجہ کیا۔ چھمکنے کو بھی جیسے کوئی بات یاد آگئی، مسکرا

کے بولا۔ ”ہاں لاث صاحب! اب چسکی بھی لگائے گا“ اچھا لے بھائی۔ ”پہمٹن ڈبل سگریٹ سگا کر اس کے سامنے بیٹھ گیا اور لمبے لمبے کش لے کر دھواں گھوڑے کے نتھنوں پر چھوڑتا رہا۔ سگریٹ سلگتے سلگتے اتنا رہ گیا کہ جن دونوں انگلیوں میں دبا رکھا تھا ان کے ناخنوں اور ہونٹوں پر تیز جلن محسوس ہونے لگی، مزید کش لگانا ممکن نہ رہا۔ گھوڑے نے دونوں کان ڈھیلے چھوڑ کر گردن جھکالی۔ پہمٹن نے تو بڑا اس کے منہ پر چڑھایا اور خود مست چال چلتا ہوا ”ننو ماڈرن کراچی زلف تراش و گرم تمام“ میں گھس گیا۔

حسب توفیق میک اپ کے ساتھ وہ اسٹیشن پہنچا تو ساتھی کو جو ان اسے دیکھ دیکھ کر ہنسے جارہے تھے اور رنگ رنگ کے فقرے کس رہے تھے۔ وہ کسی کی بات کی طرف دھیان ہی نہیں دے رہا تھا۔ دراصل ماضی میں جب بھی وہ ایک نئے عزم کے ساتھ کسی ساتھی سے بھڑا، نتیجہ ہر بار یہی نکلا کہ پہمٹن پٹ گیا۔ آج چونکہ ویسے بھی وہ ذہنی طور پر خود کو کو جو ان برادری سے خارج کر چکا تھا اس لیے کسی بھی ”گھٹیا“ شخص کی بات کا جواب دینے کا روادار نہیں تھا۔

جوں ہی لیڈی اسٹیشن کی میڑھیاں اُترتی دکھائی دی، بیش تر کو جو انوں نے بندروں کی طرح دانت نکوس کر ایک دوسرے کو متوجہ کیا اور دبو نے ہانک لگائی۔ ”چل اوئے پہمٹن! تیری بے بے آئی آ۔“ لیڈی تانگے میں بیٹھ چکی تو کسی نے سر نکالا۔ ”قسمت والیاں نے بالو تانگے تے بھائی ہوئی آ۔“

راستے میں پہمٹن نے اپنی چندھی آنکھوں سے دنیا جمان کی مدھ اور مستی اندھیلے ہوئے پان کی پیک میں ڈوبے چھوٹے چھوٹے گھسے ہوئے کالے دانت نمایاں کر کے اپنا مدعا بیان کر دیا۔ لیڈی اس کا الجھا ہوا مہمل سا جملہ سن کر خود الجھ گئی۔ پھر کچھ سمجھ کر توقف سے بولی۔ ”پہمٹن! تمہارا تانگا گھوڑا کتنے کا ہے؟“

پہمٹن سینہ پھیلا کر بولا۔ ”اجی کم آج کم، کم آج کم، دو ہزار دو سو روپے کا ہو گا۔“

وہ مسکرا کر بولی۔ ”ابے زرخواہ! چرس پی اور موج کر۔ میں جس دوست کو ملے آتی ہوں، وہ ایک وقت میں مجھ پر ہزار

سب بنگ

روپے خرچ کر سکتا ہے۔ کوئی دو لاکھ کی کوٹھی میرے نام کر رکھی ہے۔ چنڈا گل خیرد۔ میرے چندا خواب دیکھنے چھوڑ دے۔ یہ لے سو روپیہ، میری طرف سے اپنی بیوی کے لیے کوئی تحفہ لے کر جانا۔ جھنڈو کہیں کے۔“ اس نے سو روپے کا ایک کنوارا نوٹ پرس سے نکال کر اس کی آنکھوں کے سامنے نہایا اور اس کے شلوکے کے گریبان میں اڑس کر ایک شان بے نیازی سے مسکرا کر بولی۔ ”تمہارے اب تک بیالیس، روپے بنتے ہیں۔ کبھی اور ضرورت پڑے تو بڑا جھبک مانگ لینا۔“

پہمٹن نے کئی مرتبہ ماریں کھائی تھیں، پولیس سے سواریوں کے ہاتھوں اور اپنے ساتھیوں سے لیکن آج اسے یوں لگا جیسے لیڈی نے اسے بھرے تانگا اسٹینڈ پر الف ننگا کر کے بڑی ستھری مار ماری ہے۔ آج اس نے ایک کے بجائے چار گولیاں چرس کی خریدیں اور قبرستان کے ساتھ درخت کے نیچے تانگا کھڑا کر کے گھوڑے کے آگے راتب کا تو بڑا رکھ دیا۔ خود گھاس پہ لٹ کر وقفے وقفے سے ڈبل سگریٹ پینے لگا۔ سگریٹ کا مکھل لمبا ہو جاتا تو بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پہ جھاڑ کر تبرک کے طور پر زبان سے چاٹ جاتا، شاید اس خیال سے کہ کچھ نہ کچھ اثر راکھ میں رہ گیا ہو۔ وہ بہر حال اپنے پیسوں کا نعم البدل وصول کرنا چاہتا تھا۔ جب وہ ہواؤں کی آڑان مکمل کر چکا تو اسے صبح گھر میں زلیخا کو مارنے کا منظر یاد آگیا۔ آج اسے دل میں افسوس ہونے لگا۔ اس نے سوچا کہ پہلے تو وہ یوں ہی ذرا اپنی مردانگی کا رسکے جمانے کے لیے مارتا تھا لیکن آج سالی لیڈی نے خواہ مخواہ بے چاری کی پٹائی کرادی۔ لیڈی کا خیال دل میں آتے ہی وہ بڑبڑانے لگا۔ ”ہت تیرے کی سالی، بڑی لیڈی بنی پھرے، کجھری۔ ارے

ہر قسم کی کوارٹز اور آٹومینک گھڑیوں کی
سروس اور ریپیرنگ کے لیے



دکان نمبر ۲۱، حکیم سینٹر نزد سٹی پوسٹ آفس،

صدر کراچی — فون: ۵۶۷۳۲۱۵

تیری ایسی پوشاک (پوشاک) میری بلیکھی پننے تو پری لگے پری۔" پھر وہ لیڈی کے اعزاز میں اپنی گالیوں کا خزانہ لٹانے لگا۔ جب تھک گیا تو ماضی قریب ترین کی اپنی تشنہ تکمیل خواہش کی تشفی کے لیے اپنے گھوڑے کو بھی ملوث کر لیا۔ پھر کچھ مطمئن ہو گیا گویا اہم مقدمہ لڑنے کے لیے کوئی مناسب وکیل کر لیا ہو۔

گھوڑا تو بڑے میں تھو تھنی گھسیڑے، رات ب کھاتے کھاتے ایک لمحے کو رک کر اپنے مالک کو تکتا اور لمبی سی پھر رر کرتا۔ پھمکن کو یوں محسوس ہوتا جیسے گھوڑا کہہ رہا ہو "دُرفنے منہ پھمنا۔" پھمکن نے اسے بُری طرح ڈانٹ دیا جیسے گھوڑے نے زور دار آواز میں ہنسنا کر اُسے چڑایا ہو۔ پھمکن سمجھا جیسے گھوڑا کہہ رہا ہو۔ "چڈا گل خیر۔" میرے چندا۔ کچھ کش ادھر بھی۔" پھمکن کو گھوڑے کی اس حرکت پر غصہ آگیا۔ اس نے گھوڑے کو ماں کی گالی بکی۔ گھوڑے نے گالی کا جواب گالی سے دینے کے بجائے تھو تھنی اس کی طرف بڑھا کر اوپر والا ہونٹ پورے کا پورا اٹھایا۔ نئے زر چٹکے کے آمیزے سے لبریز دانٹوں کی نمائش کی گویا اپنے مالک کا منہ چڑا رہا ہو۔ پھمکن گھوڑے کی گستاخی پر سنج پا ہو گیا اور اسے اونچی آواز میں گالیاں بکنے لگا۔ گھوڑے نے شرمندہ ہو کر پھر سے تو بڑے میں منہ مٹھالیا اور کڑک کڑک کرنے لگا۔ یہ مشکل دو ہی ڈبل سگریٹ پیے ہوں گے کہ پھمکن کے حواس مختل ہو گئے اور وہ تحت اثر میں اترنے لگا۔

☆—☆—☆

زلیخا آج صبح والی مار پر اتنی دل گرفتہ نہیں تھی جتنی بچوں کی بھوک پر رنجیدہ تھی۔ وہ پھمکن کے ظلم برداشت کرتی رہی تھی کہ اس کے بچوں کو صبح چائے، رس اور دن رات کا کھانا مل جایا کرتا تھا۔ جب دن کو بھی پھمکن گھر نہ آیا اور کھانے کو کچھ نہ پکا، بچے بلکنے لگے تو زلیخا کے خالی بُت میں ایک روح نے جنم لے لیا۔ اسے قطعاً پروا نہ رہی کہ راج پوتوں کی بہو بے پردہ ہونے جا رہی ہے، نہ اسے پھمکن کا خوف رہا۔ وہ سیدھی ماسے کی دکان پر گئی۔ ماں نوٹ گرن رہا تھا۔ زلیخا کو سامنے دیکھ کر کچھ دیر چپ رہا، اس کا چہرہ پڑھتا رہا پھر اُسے موڑھے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ زلیخا نے کہا۔ "اماں!

بچے بھوکے ہیں، کچھ پیے دے دے۔"

اماں بولا۔ "اری بلیکھاں! تمیں پاگل پن چھوڑ دے، اری جالم! آج تمیں پھر پٹی اس کتے سے، میں سب سُنوں بچ والے دروہتے سے لگ کے جو تیرے سے پیتے۔"

"اماں! بچے بھوکے ہیں، کچھ پیے دے دے۔" زلیخا پھر بولی۔

اماں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے صبر کی تلقین کی اور خود اپنی بات جاری رکھی۔ "اری بھاگ چل میرے ساتھ۔ میرے پلے اتے روپے ہیں کہ تمیں سوچ بھی نہ سکے۔ تمام جندگی عیس (بیش) کرے گی۔"

"اماں! تمیں کچھ دے گا بھی یا میں جاؤں۔ بچے بھوک سے تڑپ رہے۔" اس کی جان بس بچوں کی بھوک میں اٹکی ہوئی تھی۔ وہ ایک ہی بات دہراتی رہی۔ اماں نے چند نوٹ اس کے ہاتھ میں تھمائے، اسے گھر چلنے کو کہا اور بتایا کہ وہ خود روٹی لے کر اس کے پاس آجائے گا۔ زلیخا گھر لوٹ گئی۔

تھوڑی ہی دیر میں اماں بہت سی تندوری روٹیاں، ڈھیروں قیسے کی تلی ہوئی نکلیاں، کباب اور چٹنی اخبار میں لپیٹ کر لے آیا اور بچوں کے آگے رکھ کر بولا۔ "بلیکھاں! نئے دکان کب کی بچ رکھی، رقم میرے کھسے ماں پڑی۔ میں رات ملتان، جارہیا۔ نئے وہاں مکان اور دکان کھرید رکھی۔ تمیں جو دماغ سے سوچو تو ابھی روٹی پانی کھاپی کے اڈے پہ چلو۔ میں دکان کی چابی حوالے کر کے ابھی سیدھا ادھر پہنچا۔ اگر تمیں ادھر اڈے پہ ہوئی تو اسٹھسے چلیں گے۔ نہیں تو بھائی اپن اکیلے ہی جاویں گے۔" اور نکلتے نکلتے رک کر پھر بولا۔ "تیرا وہ چری کھوند (خاوند) کبرستان میں مردار کی تریا پڑ رہیا، سُسر! نئے کھود اپنی انکھیاں سے دیکھا۔" اماں باہر نکل گیا۔

بچے نذیدوں کی طرح کھائے جا رہے تھے۔ زلیخا جلدی جلدی کچھ کپڑے سمیٹ کر ایک ٹرک میں ڈالنے لگی۔

لاری اڈے پر زلیخا اماں سے بولی۔ "اماں! اگر تمیں کبھی میرے بچوں کو مارا یا پیٹ بھر کے کھانے کو نہ دیا تو یاد رکھ، مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔ ابھی سوچ لے۔ میں پھمکن کے گھر لوٹ چلوں۔"

اماں مسکراتے ہوئے بولا۔ "اری بگلی! میں کیوں ماروں گا سب بگ

پاس کھڑا ہوا کانشیل فکر مند ہو کر بولا۔ ”شاہ جی! جانی کسی یار کے ساتھ بھاگ گئی ہوگی۔“

شاہ سوار نے اپنے پاؤ پاؤ بھر کے لال لال ڈیلوں پر سے پوٹوں کے غلاف یکسر نوچ ڈالے اور گرج کر سپاہی کو جواب دیا۔ ”بھونک نہیں اوئے کتے۔۔۔ پورا سال میں نے نرائی کر لی اس پر وہ مجھ سے نہیں بچنی۔ پتھر لیکر ہے وہ رن بد معاش نہیں۔ اس ماں کے یار نے کہیں خود بیچ دی ہے یا جوئے میں ہار گیا ہے۔ اب کنجری نسل شاہ سوار شاہ کو چکر دے رہا ہے۔“ کانشیل سہم کر چپ ہو گیا۔

شاہ سوار بھرے ہوئے بر شیر کی طرح دھاڑا اور الٹا ہاتھ پھمکن کی گڈی پہ رکھ کے سیدھے ہاتھ کی ہتیلی اس کی ٹھوڈی کے نیچے جمائی تو پورے سوانٹ لمبے ہاتھ نے اس کا شاہ دولہ کے چوہے جیسا سر آہنی شکنجے کی طرح اپنی گرفت میں کس لیا۔ دوسرے ہی لمحے شاہ سوار نے پھمکن کو ہوا میں معلق کر دیا، وہ اپنی ننگی ٹانگوں سے تیز تیز سائیکل چلانے لگا گیا۔ ابھی چند ہی لمحے گزرے ہوں گے کہ پھمکن پھڑکنے لگا جیسے شیر کے پنجے میں خرگوش۔ شاہ سوار نے اپنا دیو کا سا ہاتھ ذرا اور اونچا کر کے آگے کی طرف جھنکا دے کر واپس کھینچ لیا، پھمکن دھڑام سے نیچے آ رہا۔

شاہ سوار نے قدرے توقف کر کے اپنے تئیں کچھ اطمینان کر لیا تو اگلے مرحلے پر اپنا ہاتھ جیسا پاؤں پھمکن کے جسم پر ایک ایسی جگہ رکھ کر ذرا سادبایا کہ اگر وہ مرد کا پچھ آج زندہ بھی بچ جاتا تو مستقبل میں اپنی کسی گالی میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے قابل نہ رہتا۔ وہ دہشت اور اذیت کے پہاڑ تلے دبا ہوا ایسی خوف ناک اور دل خراش آواز میں چلانے لگا جیسے کسی دیران سڑک پر کوئی تیز رفتار ٹرک آوارہ کتے کا پچھلا دھڑاپا اپنے ٹائروں تلے کچل کر نکل گیا ہو۔

شاہ سوار نے اپنا پاؤں اٹھایا تو وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر ہلکے ہلکے فریاد کرنے لگا۔ ”ہو رہا مائی باپ! مانف کر دو۔ منے کھنیر نے کھد نیک بھکت کو گھر سے نکالا۔ آپ بچ بولو ہو وہ بھاگی نہیں۔“

ان مسواں کو۔ لے تیں ابھی ساری رکم پاس رکھ لے۔“ وہ شلو کے میں ہاتھ ڈالنے لگا۔ زلیخانے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

☆

پھمکن تھانے میں دہائی دے رہا تھا۔ ”رے میں لٹ گیا“ میرا گھرا جڑ گیا۔ کوئی میری ارج سنو۔“

شاہ سوار دونوں کندھوں پر ایک ایک پھول سجائے اس کے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس نے طنزیہ انداز میں پھمکن سے استفسار کیا۔ ”اچھا بتا، تیرا سونا کتنا لے گئی اور نقد رقم؟“ پھمکن رو کے بولا۔ ”ہجو رہا! وہ مجھ سے دھوکا کر گئی، میری جو رو تھی، دل کی رانی، بے پھائی کر گئی۔ میں کیا بولوں، وہ میری ساری کھدائی لے گئی۔“

شاہ سوار نے اس کے شلو کے کی جیبیں ٹٹولیں تو چرس کی گولیاں برآمد ہوئیں۔ شاہ سوار نے گولیاں گھما پھرا کے دیکھیں اور اس کے بالوں میں ہاتھ کی انگلیاں پھنسا کے ایسا جھنکا دیا کہ پھمکن کے پاؤں کی انگلیوں تک کرنٹ دوڑ گیا۔ اس نے درد سے پھریری لی اور ہاتھ جوڑ کر التجا کی۔ ”سرکار! میں پھریادی (فریادی) ہوں، کچھ ترس کر دو۔“

شاہ سوار نے جواباً کہا۔ ”کتے کے بچے! یہ جتنی تو چرس پیتا رہا ہے، اپنی بیوی کو کچھ کھلایا یا پلایا ہوتا تو کھن مائی جیسی رن تھی۔ وہ حور آج تیرے پاس ہی ہوتی۔“ قدرے توقف سے اس نے پہلا تھپڑ پھمکن کے سیدھے گال پر جڑ دیا اور ابھی وہ سنبھلا بھی نہ تھا کہ دوسرا لٹے گال پر۔ پھمکن زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ شاہ سوار کے ہارے میں مشہور تھا کہ اس کا دوسرا تھپڑ کھا کے کوئی اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں رہتا۔ اس نے گرج کر پوچھا۔ ”بول اوئے تیری۔۔۔ اصل بات کیا ہے؟“

پھمکن تھر تھر کانپ رہا تھا۔ شاہ سوار نے اسے بالوں سے کھینچ کر ایک جھٹکے سے کھڑا کیا تو خوف سے پھمکن کے گھٹنے بچ رہے تھے۔ چار خانہ دھوتی کھل کر نیچے گر پڑی اور شر شر پیشاب بہہ کر کچی زمین پر گرنے لگا۔ شاہ سوار نے ایک اور تھپڑ مارنے کو ہاتھ بلند کیا ہی تھا کہ وہ کھکیا کر نیچے خاک و بول کے آمیزے پہ لوٹ لگانے لگا۔

خوف اور دہشت سے پھمکن کی حالت مہدوش ہو گئی تو

سب نگ

